تدبرِ قرآن

۸۳

المطفّفين

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلّق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــ الانفطار ـــــ کا تکملہ و تتمہ ہے۔ دونوں کا عمود بنیادی طور پر ایک ہی ہے۔ سورۂ انفطار کے آخر میں ابرار اور فجّار کی جو تقسیم ہے اس سورہ میں اسی کی تفصیل ہے۔ صرف استدلال کی بنیاد دونوں میں الگ الگ ہے۔ سابق سورہ میں استدلال اللہ تعالیٰ کی ان صفات سے ہے جو خود انسان کی خلقت کے اندر نمایاں ہیں۔ اس سورہ میں استدلال اس فطرت سے ہے جو فاطر نے انسان کے اندر ودیعت فرمائی ہے۔

اس استدلال کی تقریر بالاجمال یوں ہے کہ انسان بالطبع عدل اور خیر کو پسند کرنے والا اور ظلم و شر سے نفرت کرنے والا ہے۔ اس کی یہ پسند اور ناپسند اس بات کی شہادت ہے کہ فاطرِ فطرت عدل اور ظلم یا بالفاظ دیگر عادل اور ظالم میں فرق و امتیاز کرنے والا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ نیک اور بد دونوں اس کے نزدیک یکساں ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ انسان کی فطرت میں نیک اور بد میں یہ امتیاز کیوں رکھتا؟

رہا یہ سوال کہ انسان جب طبعاً نیکی پسند ہے تو وہ بدی کیوں کر گزرتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ بدی اس وجہ سے نہیں کرتا کہ یہی اس کو طبعاً مرغوب ہے۔ طبعاً تو اس کو مرغوب نیکی ہی ہے لیکن بسا اوقات نفس کے دوسرے داعیات سے وہ مغلوب ہو کر، اپنی فطرت کے خلاف بدی کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ اگر بدی اور ناانصافی اس کو طبعاً مرغوب ہوتی تو اس کا تقاضا یہ تھا کہ کوئی اس کے ساتھ ناانصافی کرتا تو وہ اس پر بھی راضی رہتا لیکن ہر شخص دیکھتا ہے کہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ وہی شخص جو دوسروں کے لیے ناپ اور تول میں بے ایمانی کرتا ہے جب دوسرے اس کے ساتھ یہی معاملہ کرتے ہیں تو وہ چیختا اور فریاد کرتا ہے۔

قرآن نے اس سورہ میں انسان کی اسی فطرت کو شہادت میں پیش کر کے یہ تذکیر فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ خود عادل ہے اور اس نے اپنے بندوں کے اندر بھی عدل اور خیر کی محبت ودیعت فرمائی ہے اس وجہ سے لازمی ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں ان لوگوں کو بھرپور انعام دے جو اپنی فطرت کے اس نور کی قدر کریں اور ان لوگوں کو سزا دے جو اس کی بے حرمتی کریں۔

قیامت کے حق میں یہ طریقِ استدلال قرآن نے جگہ جگہ اختیار کیا ہے اور ہم برابر اس کی وضاحت کرتے آرہے ہیں۔ خاص طور پر سورۂ قیامہ میں نفسِ لوامہ کی قسم اور بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ (القیٰمة - ۷۵: ۱۴-۱۵) (بلکہ انسان خود اپنے اوپر حجت ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذرات تراشے) کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے:

(۱-۶) ان لوگوں کے حال پر افسوس جو اپنے لیے تو چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہونے پائے لیکن جب وہ دوسروں سے معاملہ کرتے ہیں تو ان کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں۔ حالانکہ عدل پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ جو بات وہ اپنے لیے پسند نہیں کرتے دوسروں کے لیے بھی پسند نہ کریں۔ ان کا یہ رویہ شاہد ہے کہ وہ اس عظیم دن کی توقع نہیں رکھتے جس دن لوگ اپنے رب کے حضور میں پیشی کے لیے اٹھائے جائیں گے۔

(۷-۱۷) ان فجار کے انجام کی تفصیل جنھوں نے جزاء وسزا کے دن کو جھٹلایا اور زندگی خدا کی نافرمانی میں گزاری۔

(۱۸-۲۸) ابرار کے انجام کا بیان جو روزِ جزا پر ایمان لائے اور جنھوں نے زندگی اس سے ڈرتے ہوئے گزاری۔

(۲۹-۳۶) اس انقلابِ حال کی تصویر جو ایک دن سب کے سامنے آنے والا ہے۔ آج کفار اپنے حال میں مگن ہیں اور اہلِ ایمان کا مذاق اڑا رہے ہیں، اس دن اہل ایمان اپنی فیروزمندی پر شادمان ہوں گے اور کفار کا مذاق اڑائیں گے۔

سُوْرَةُ الْمُطَفِّفِيْنَ

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيات:۳۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اٰيات ۱-۳۶

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ① الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ② وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ③ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ④ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ⑤ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ⑥ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ⑦ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ⑧ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ⑨ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ⑩ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ⑪ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ⑫ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ⑬ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ⑭ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ⑮ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ⑯ ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ⑰ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ⑱ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ⑲ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ⑳ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ㉑ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ㉒

عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿۲۳﴾ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ﴿۲۴﴾ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿۲۵﴾ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ﴿۲۷﴾ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَاِذَا انْقَلَبُوْا اِلٰى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْا اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ﴿۳۲﴾ وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۳۳﴾ فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ﴿۳۴﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾

ع ۳۶ ۸

ترجمۂ آیات ۱ - ۳۶

برا ہو، ناپ تول میں کمی کرنے والوں کا! جو دوسروں سے نپوائیں تو پورا نپوائیں اور جب ان کے لیے ناپیں یا تولیں تو اس میں کمی کریں۔ کیا یہ لوگ یہ گمان نہیں رکھتے کہ ایک دن وہ اٹھائے جانے والے ہیں۔ ایک عظیم دن کی حاضری کے لیے جس دن لوگ اٹھیں گے خداوند عالم کے حضور پیشی کے لیے۔ ۱-۶

ہرگز نہیں، فاجروں کے اعمال نامے سجّین میں ہوں گے۔ اور تم کیا جانو کہ سجّین کیا ہے! لکھا ہوا دفتر! اس دن تباہی ہے جھٹلانے والوں کی! جو روز جزا کو جھٹلا رہے ہیں۔ اس کو تو وہی جھٹلاتے ہیں جو تعدّی اور حق تلفی کرنے والے ہوتے ہیں۔ جب اس کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو اگلوں کے فسانے ہیں۔ ہرگز نہیں، بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ اس دن

وہ اپنے رب سے اوٹ میں رکھے جائیں گے۔ پھر وہ جہنم میں پڑنے والے بنیں گے۔ تب کہا جائے گا، یہ وہی چیز ہے جس کو تم جھٹلاتے رہتے ہو۔ ۷-۱۷

ہرگز نہیں، بے شک اچھوں کے اعمالنامے عِلّیّین میں ہوں گے۔ اور تم کیا سمجھے کہ عِلّیّین کیا ہے! لکھا ہوا دفتر۔ مقرّبوں کی نگرانی میں۔ بے شک نیک بندے عیش میں ہوں گے تختوں پر بیٹھے سیر دیکھتے۔ ان کے چہروں پر آسائش کی بشاشت جھلک رہی ہوگی۔ سربمہر شرابِ خالص ان کو پینے کو ملے گی۔ جس پر مشک کی مہر ہوگی۔ یہ چیز ہے جس کی طلب میں طالبوں کو سرگرم ہونا چاہیے! اور اس میں تسنیم کی ملونی ہوگی۔ ایک خاص چشمہ جس پہ مقرّبین بیٹھ کر پئیں گے۔ ۱۸-۲۸

جو مجرم رہے ہیں وہ ان لوگوں کے حال پر ہنستے رہے ہیں جو ایمان والے تھے۔ اور جب ان کے پاس سے گزرتے تو کن انکھیوں سے اشارے کرتے اور اپنے لوگوں میں لوٹتے تو مگن ہوکر لوٹتے۔ اور جب ان کو دیکھتے تو کہتے کہ یہ بالکل گمراہ ہیں، یہ ان پر کوئی نگران بنا کر تو نہیں بھیجے گئے ہیں! پس آج ایمان والے کفار کے حال پر ہنسیں گے، تختوں پر بیٹھے، سیر دیکھتے — کیوں پایا نا کفار نے اپنے کیے کا بدلا!! ۲۹-۳۶

الفاظ واسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ (۱)

ان لوگوں پر لعنت جن کے لینے کے باٹ اور اور دینے کے باٹ اور ہیں

یہ جملہ صرف خبریہ نہیں ہے بلکہ اس کے اندر لعنت اور پھٹکار کا مضمون بھی مضمر ہے۔ 'تطفیف' کے معنی ناپ تول میں کمی کرنے کے ہیں یعنی جو لوگ ناپ اور تول میں کمی کرنے والے ہیں ان کے لیے تباہی اور ان پر خدا کی مار اور پھٹکار ہے۔

الَّذِیۡنَ اِذَا اکۡتَالُوۡا عَلَی النَّاسِ یَسۡتَوۡفُوۡنَ ۫ۖ وَ اِذَا کَالُوۡہُمۡ اَوۡ وَّزَنُوۡہُمۡ یُخۡسِرُوۡنَ (۲-۳)

یہ ان کمی کرنے والوں کی صفت بیان ہوئی ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہاں مجرد ناپنے اور تولنے میں کمی کرنا زیر بحث نہیں ہے بلکہ ایک خاص کردار زیر بحث ہے۔ وہ یہ کہ آدمی دوسروں سے اپنے لیے نپوانے اور تلوانے میں تو بڑا چوکس اور حساس ہو، ہرگز نہ چاہے کہ جو چیز اس کے لیے ناپی یا تولی جائے اس میں رتی برابر بھی کمی ہو لیکن وہی شخص جب دوسروں کے لیے ناپے اور تولے تو اس میں ڈنڈی مارنے کی کوشش کرے۔ یہ کردار اس امر پر شاہد ہے کہ انسان عدل کے تصور اور اس کے واجب ہونے کے شعور سے عاری نہیں ہے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ لینے کے باٹ اور دینے کے باٹ الگ الگ نہیں ہونے چاہئیں بلکہ ان کا ایک ہونا ضروری ہے۔ نیز وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ جو چیز اسے اپنے لیے پسند نہیں ہے وہ اسے دوسروں کے لیے بھی پسند نہیں کرنی چاہیے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی فطرت کے خلاف محض اپنی خود غرضی سے مغلوب ہو کر کرتا ہے اور یہ ایک کھلی ہوئی ناانصافی بھی ہے اور ایک سخت قسم کی دنائت بھی۔

عدل سے محبت کے باوجود ارتکابِ ظلم کی وجہ

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے اندر فاطر فطرت نے عدل اور ظلم کے درمیان امتیاز کے لیے ایک کسوٹی بھی رکھی ہے اور عدل کے ساتھ محبت اور ظلم سے نفرت بھی ودیعت فرمائی ہے۔ اس کے باوجود وہ ظلم کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ عدل اور ظلم میں امتیاز سے وہ قاصر ہے یا ظلم کا ظلم ہونا اس پر واضح نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، محض یہ ہے کہ وہ اپنی کسی خواہش یا کسی جذبہ سے مغلوب ہو کر اپنے نفس کے توازن کو قائم نہیں رکھ پاتا۔

ایک چور جو دوسروں کے گھروں میں نقب لگاتا ہے وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ کوئی دوسرا اس کے گھر میں نقب لگائے، ایک قاتل جو دوسروں کو قتل کرتا ہے یہ نہیں پسند کرتا کہ کوئی اس کی یا اس کے کسی

عزیز و قریب کی جان کے درپے ہو، کوئی زانی جو دوسروں کے عزت و ناموس پر حملہ کرتا ہے اس بات پر راضی نہیں ہوتا کہ کوئی اس کے عزت و ناموس پر حملہ آور ہو۔ بلکہ انہی چوروں، انہی قاتلوں اور انہی زانیوں سے اگر ان کی غیر جانبدارانہ رائے معلوم کرنے کی کوئی شکل ہو تو وہ اس حقیقت کا بھی اعتراف کریں گے کہ چوروں، قاتلوں، زانیوں اور اس قبیل کے دوسرے مجرموں کے لیے معاشرے میں کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔ معاشرے میں جگہ انہی کے لیے ہونی چاہیے جو جان و مال اور ان کے عزت و ناموس کے اسی طرح حفاظت کرنے والے ہوں جس طرح وہ اپنی جان اور اپنی عزت کی حفاظت چاہنے والے ہیں۔

انسان کی فطرت سے ایک روزِ جزا پر استدلال

انسان کا یہ طرزِ عمل اور اس کی فطرت کا یہ پہلو اس بات کی بدیہی شہادت ہے کہ نہ وہ نیک اور بد کو یکساں سمجھتا اور نہ اس بات پر راضی ہے کہ دونوں قسم کے لوگوں سے ایک ہی طرح کا معاملہ کیا جائے بلکہ اس کا غیر جانبدارانہ فیصلہ یہی ہے کہ دونوں کے ساتھ الگ الگ معاملہ ہونا چاہیے۔ یہ چیز اس بات کو بھی متلزم ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسا دن لائے جس میں نیکوں اور بدوں کے ساتھ ان کے اعمال کے مطابق معاملہ کرے۔ اگر ایک ایسا دن نہ آئے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس دنیا کے خالق کے نزدیک نیک اور بد دونوں یکساں ہیں درآنحالیکہ یہ چیز اس فطرت کے منافی ہے جو فاطر نے انسان کے اندر ودیعت فرمائی ہے۔ یہاں انسان کی اسی فطرت سے ایک روزِ جزا و سزا کے لازمی ہونے پر دلیل اور ان منکرینِ قیامت پر حجت قائم فرمائی ہے جو اپنی فطرت کی اس شہادت سے تو انکار نہیں کر سکتے تھے لیکن قرآن کے انذارِ قیامت کی تکذیب پر تلے ہوتے تھے۔

ایک ضعیف شانِ نزول

اس آیت کے تحت مفسرین نے ایک روایت نقل کی ہے کہ انصار میں ناپ تول میں کمی کی خرابی موجود تھی اس وجہ سے یہ آیت نازل ہوئی۔ لیکن اول تو یہ سورہ مکی ہے، مدنی نہیں ہے؛ پھر انصار میں یہ خرابی رہی بھی ہوگی تو اتنی ہی رہی ہوگی جتنی اہلِ مکہ میں رہی ہوگی بلکہ اہلِ مکہ کے اندر اس کے پائے جانے کے زیادہ امکان تھے اس لیے کہ وہ بالعموم تجارت پیشہ تھے جبکہ انصار کا اصل پیشہ زراعت تھا۔ پھر سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ یہ آیت ناپ تول میں کمی کرنے کی مذمت کے سیاق میں نہیں ہے بلکہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اس حقیقت کے بیان میں ہے کہ انسان عدل و ظلم میں امتیاز سے قاصر نہیں ہے۔ وہ برائی کرتا ہے تو اپنی فطرت کی شہادت کے خلاف محض اپنے نفس کی کسی خواہش کی پاسداری میں کرتا ہے۔ انسان کی یہ فطرت لازم کرتی ہے کہ ایک دن ایسا آئے جس میں نیکوں اور بدوں کے درمیان کامل امتیاز ہو۔ اگر وہ ایک ایسے دن کے آنے سے انکار کرتا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ جزا و سزا کے مواجہے سے گریز کرنا چاہتا ہے حالانکہ یہ چیز اس کی اپنی فطرت کا مطالبہ ہے۔

اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّھُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۙ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ ۙ یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۴-۶)

ان لوگوں کو ملامت جو اپنی فطرت کی شہادت سے کان بند کیے ہوئے ہیں

یہ اس طرح کے لوگوں کے حال پر اظہارِ تعجب بھی ہے اور ان کو سرزنش بھی کہ کیا یہ لوگ یہ گمان نہیں رکھتے کہ ایک ایسا عظیم دن آنے والا ہے جس میں لوگ اپنے رب کے حضور میں پیشی کے لیے اٹھائے جائیں گے؟ یعنی ایک ایسے دن کے ظہور کا اندیشہ ہر شخص کے دل کے اندر ہونا چاہیے اس لیے کہ اس کی شہادت ہر شخص کی فطرت کے اندر موجود ہے۔ اگر کسی کا دل اس اندیشہ سے خالی ہے تو وہ خود اپنی فطرت کی آواز سے اپنے کان بند کیے ہوئے ہے حالانکہ وہ دن کوئی معمولی دن نہیں ہوگا بلکہ ایک نہایت ہی عظیم دن ہوگا۔ اس دن لوگ اس لیے اٹھیں گے کہ خداوند کائنات کے سامنے پیش ہوں اور ان سے پرسش ہو کہ انھوں نے کیا بنایا اور کیا بگاڑا، پھر اپنے اعمال کے مطابق وہ جزا یا سزا پائیں۔

'رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ' کے اندر اس دن کی عظمت، ضرورت اور اس کے فیصلوں کے ناطق ہونے کی جو دلیلیں مضمر ہیں ان کی وضاحت ایک سے زیادہ مقامات میں ہو چکی ہے۔ ان کو ذہن میں تازہ کر لیجیے تب اس کا اصلی زور سمجھ میں آئے گا۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ (۷)

مخاطبوں کے زعم کی تردید

'کَلَّا' مخاطبوں کے اس زعمِ باطل کی تردید کے لیے بطور زجر آیا ہے جس کا اشارہ اوپر والی آیت میں موجود ہے۔ یعنی وہ اس فکر سے بالکل بےفکر ہیں کہ ان کے سامنے حساب کتاب اور جزاء و سزا کا کوئی مرحلہ آنے والا ہے جس میں نیکوں اور بدوں کے درمیان اللہ تعالیٰ فرق کرے گا بلکہ وہ یہ گمان کیے بیٹھے ہیں کہ اول تو کوئی دن آنا نہیں ہے اور آیا بھی تو وہ اپنی خاندانی وجاہت اور اپنے دیوتاؤں کی بدولت وہاں بھی اس سے زیادہ عیش لوٹیں گے جو عیش یہاں لوٹ رہے ہیں۔ ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ہرگز نہیں، اس قسم کے طفلانہ خیالات میں اپنی عاقبت برباد نہ کرو۔ اس دن ابرار اور فجار میں مشرق و مغرب کی دوری ہوگی۔ 'فُجَّار' کے اعمال نامے 'سِجِّیْن' میں ہوں گے اور ابرار کا ذکر آگے آ رہا ہے کہ ان کے اعمال نامے 'عِلِّیِّیْن' میں ہوں گے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (۸-۹)

'سجین' کی تحقیق

لفظ 'سِجِّیْنٌ' اوپر والی آیت میں لغوی مفہوم میں نہیں بلکہ بطور ایک نام کے آیا ہے اس وجہ سے قرآن نے خود ہی اس کی وضاحت بھی فرما دی ہے۔ اس طرح کے نام قرآن میں متعدد آئے ہیں اور ہر جگہ ان کی وضاحت بھی فرما دی گئی ہے۔ سورۂ دہر میں ان کی بعض مثالیں گزر چکی ہیں۔ آگے اس سورہ میں بھی 'عِلِّیُّوْنَ' اور 'تَسْنِیْمٌ' کے الفاظ اسی نوعیت سے آئے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ میں اصل اہمیت ان کے لغوی مفہوم کی نہیں بلکہ ان کے اصطلاحی مفہوم یا ان کے تسمیہ کی ہوتی ہے۔

'وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ' یہ اسلوب بیان 'سِجِّیْنٌ' کے ہول کو ظاہر کرنے کے لیے اختیار فرمایا گیا

ہے کہ تم کیا سمجھے کہ 'سِجّین' کیا ہے! اس کو کوئی معمولی چیز نہ سمجھو! وہ تباہ ہوا جس کا نام یا جس کے اعمال اس میں درج ہوئے!

'کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ'۔ وہ لکھا ہوا دفتر ہے۔ یعنی اس میں تمام مجرمین کا سارا ریکارڈ بشکل تحریر محفوظ کیا جاتا ہے۔ 'بشکل تحریر' کی قید سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ نہ اس میں کسی سہو و نسیان کا کوئی امکان ہے اور نہ اس کے حجّت ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش۔

معلوم ہوا کہ 'سِجّین' اس دفتر کا نام ہے جس میں مجرموں کے اعمال کا سارا ریکارڈ تحریری صورت میں محفوظ کیا جا رہا ہے اور جس کی بنیاد پر قیامت کے دن فیصلہ ہو گا کہ کون دوزخ کے کس درجے میں داخل کیے جانے کا سزاوار ہے۔ 'سجّین' کا مادہ 'سجن' ہے جس کے معنی قید یا قید خانہ کے ہیں۔ اس مناسبت سے مستحقینِ سزا کے ریکارڈ آفس کا نام 'سجّین' رکھا گیا ہے۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (۱۰-۱۱)

یعنی اس گمان میں نہ رہو کہ جس طرح آج چھوٹے پھر رہے ہو اسی طرح برابر چھوٹے ہی پھرو گے، بلکہ جب وہ جزاء و سزا کا دن ظہور میں آئے گا تو ان لوگوں کی شامت آ جائے گی جو اس کو جھٹلاتے رہے ہیں۔ اس دن وہ دیکھ لیں گے کہ ان کا کوئی قول و عمل نہ ریکارڈ ہونے سے رہ گیا ہے اور نہ اب اس کے وبال سے بچنے بچانے کی کوئی صورت ہی باقی رہی۔ مجرم اس کو دیکھ کر پکار اٹھیں گے:

'مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا'[1] (الکہف ۱۸:۴۹)۔

وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ (۱۲)

ان لوگوں کی نشاندہی جو جزا و سزا کی تکذیب میں پیش پیش ہیں

اب یہ ان لوگوں کا سراغ دے دیا جو جزاء و سزا کے دن کو جھٹلانے میں پیش پیش ہیں۔ فرمایا کہ اس کی تکذیب وہی لوگ کر رہے ہیں جو حدود سے تجاوز کرنے اور حق تلفی کرنے والے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی تکذیب کرنے کی جرأت کوئی ایسا شخص نہیں کر سکتا جس کے اندر عدل اور رحم کی ادنیٰ رمق بھی ہو۔ اس کی شہادت ہر انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے اس وجہ سے کسی خارجی دلیل کی اس کے لیے کوئی حاجت نہیں۔ ہر شخص اس کو اپنے دل کے آئینہ میں دیکھ سکتا ہے۔ البتہ ان لوگوں کو یہ چیز نظر نہیں آتی جن کے دلوں پر تعدی اور حق تلفی کا زنگ چڑھ چکا ہو۔

'عدوان' اور 'اثم' کی حقیقت پر ہم اس کے محل میں گفتگو کر چکے ہیں۔ 'عدوان' اور 'اعتداء' یہ ہے کہ کوئی دوسروں کے حقوق پر دست درازی کرے اور 'اثم' یہ ہے کہ دوسروں کے جو حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں ان کو دبا بیٹھے۔ دوسروں کے حقوق غصب کرنے یا دبا بیٹھنے کی جن کو چاٹ

---

[1] عجیب ہے یہ کتاب کہ اس نے نہ کوئی چھوٹی بات لکھنے سے چھوڑی ہے نہ کوئی بڑی بات!

تنگ ہوجاتی ہے۔ وہ جزا و سزا سے فرار کے لیے کوئی نہ کوئی راہ نکالنے کی ضرور کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کا ضمیر ان کی تعدّیوں اور حق تلفیوں سے کوئی خلش نہ محسوس کرے۔

ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ کسی حقیقت سے فرار انسان محض اس وجہ سے نہیں اختیار کرتا کہ اس کے حق میں اس کو کوئی دلیل نہیں ملی بلکہ اس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کو تسلیم کرنے سے اس کی خواہشوں اور عادتوں پر زد پڑتی ہے۔ جب ایک بات وہ ماننا نہیں چاہتا تو اپنے لیے کچھ عذرات تراشنے کی کوشش کرتا ہے اگرچہ وہ کتنے ہی لنگ ہوں۔ سورۂ قیامہ میں اسی حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے 'بَلِ الْإِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ' (القیٰمۃ - ۷۵: ۱۴-۱۵) (بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذرات تراشے)۔

اِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (۱۳)

یہ اس طرح کے مکذّبین کے طریقۂ تکذیب کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ لوگ ایک واضح حقیقت کی تکذیب اپنے ضمیر کے بالکل خلاف کرتے ہیں۔ ان کے پاس اس کے خلاف کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے دلیل کا جواب دلیل سے دینے کی جگہ محض اپنی ہٹ دھرمی اور مکابرت کا اظہار کرتے ہیں۔ فرمایا کہ جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتے ہیں: چلو ہٹو، سن لیا، اس میں ہے کیا، یہ تو محض اگلوں کے فسانے ہیں!

'اٰیٰتٌ' سے مراد وہ دلیلیں اور حجّتیں ہیں جو قیامت اور جزاء و سزا کے حق میں ان کو قرآن کے ذریعہ سے سنائی گئیں۔ ان دلیلوں کا بیان پچھلی سورتوں میں بھی ہوا ہے اور آگے کی سورتوں میں بھی آ رہا ہے۔ ساتھ ہی ان میں ان قوموں کی تاریخ کا بھی حوالہ ہے جو انذارِ قیامت کی تکذیب کے نتیجہ میں تباہ ہوئیں۔ ان چیزوں کو سن کر وہ بس ایک ہی فقرے میں ان کی تکذیب کر دیتے کہ یہ سب اگلوں کے فسانے اور پچھلوں کے قصے ہیں۔ مطلب یہ کہ ان میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو لائقِ اعتناء ہو۔

کَلَّا بَلْ سکتۃ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (۱۴)

تکذیب کی اصل علّت

یہ قرآن نے اصل حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ ان بد دماغوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ یہ اگلوں کے فسانے ہیں۔ یہ ہیں تو حقائق جن کے حق میں آفاق و انفس اور عقل و فطرت کے ناقابلِ انکار دلائل موجود ہیں لیکن ان کے اعمال کا زنگ اس طرح ان کے دلوں پر چڑھ گیا ہے کہ اب حق کی کوئی کرن ان کے اندر نفوذ ہی نہیں کرتی۔

'مَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ' سے ان کے اسی طرح کے اعمال کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر اوپر عدوان اور اثم کے تحت ہم کر چکے ہیں اور جن کے متعلق قرآن کی شہادت یہ ہے کہ جو ان کے مرتکب ہوتے ہیں وہ جزا و سزا کی تکذیب کا کوئی بہانہ ضرور ڈھونڈھتے ہیں۔

'بَلْ سکتۃ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ' میں اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آرہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فطرت کے اندر جو دلائل ودیعت فرمائے ہیں اور عقل و دل کے اندر سوچنے سمجھنے کی جو صلاحیت بخشی ہے یہ چیزیں کام اسی صورت میں آتی ہیں جب انسان ان کی قدر کرے اور ان سے فائدہ اٹھائے۔ اگر ان سے فائدہ نہ اٹھائے بلکہ ان کے مقابل میں نفس کی خواہشوں ہی کو اپنا رہنما بنا لے اور ان اعلیٰ صلاحیتوں کو ٹھکرا دے تو آہستہ آہستہ آدمی کی بدعملیوں کا زنگ ان پر چڑھنا شروع ہوتا ہے اور بالتدریج اس طرح ان کا احاطہ کر لیتا ہے کہ ان کے اندر کسی صحیح چیز کے داخل ہونے کی کوئی گنجائش سرے سے باقی ہی نہیں رہ جاتی۔

کَلَّآ اِنَّھُمْ عَنْ رَّبِّھِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (۱۵)

یعنی یہ لوگ اپنے دلوں میں یہ ارمان لیے جو بیٹھے ہیں کہ آخرت ہوئی تو جس طرح دنیا میں ان کو عزت و شرف حاصل ہے اسی طرح وہاں بھی ان کو اعلیٰ مدارج حاصل ہوں گے، ان کے یہ ارمان پورے ہونے والے نہیں ہیں بلکہ اپنے عقل و دل کے دیدے انھوں نے جو پھوڑ لیے ہیں اس کی سزا ان کو یہ ملے گی کہ وہ اپنے رب سے اس دن اوٹ میں ہوں گے۔ اوٹ میں ہونے سے مراد یہ ہے کہ یہ اس کے قرب، اس کی نظرِ عنایت، اس کے افضال و عنایات اور اس کے انوار و تجلیات کے مشاہدے سے بالکل محروم رہیں گے۔ ان کو اتنا موقع بھی نہیں ملے گا کہ اپنے رب سے کچھ عرض معروض ہی کر لیں۔

ثُمَّ اِنَّھُمْ لَصَالُوا الْجَحِیْمِ ہ ثُمَّ یُقَالُ ھٰذَا الَّذِیْ کُنْتُمْ بِہٖ تُکَذِّبُوْنَ (۱۶-۱۷)

پھر وہ جہنم میں پڑیں گے۔ اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہی ہے وہ چیز جس کو تم جھٹلاتے رہے تھے۔ 'ثُمَّ' کی تکرار سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ بات ان سے خاص اہتمام کے ساتھ کہی جائے گی اور مقصود اس سے ان کی تفضیح ہو گی۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی میں جس چیز کی پورے شد و مد سے مخالفت کی اب اس کو دیکھ لو اور اس کا مزا چکھو!

کَلَّآ اِنَّ کِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِیْ عِلِّیِّیْنَ (۱۸)

'عِلِّیُّوْنَ' کی تحقیق

'کَلَّا' یہاں بھی اسی طرح مکذبینِ قیامت کے زعمِ باطل کی تردید کے لیے ہے جس طرح آیت ۷ میں ہے۔ یعنی نیک و بد ہرگز یکساں نہیں ہوں گے بلکہ بدکاروں کے لیے جس طرح الگ رجسٹر اور الگ دفتر ہو گا اسی طرح نیکوکاروں اور وفاداروں کے لیے الگ رجسٹر اور الگ دفتر ہو گا۔ ان کے اعمال نامے 'عِلِّیِّیْن' میں ہوں گے۔

وَمَآ اَدْرٰکَ مَا عِلِّیُّوْنَ (۱۹)

جس طرح اوپر اسی اسلوب بیان میں 'سِجِّیْن' کا ذکر اس کے ہول کے اظہار کے لیے ہوا ہے اسی طرح یہاں اسی اسلوب میں 'عِلِّیُّوْن' کا ذکر اس کی عظمت و شان کے اظہار کے لیے ہوا ہے۔ یعنی

اس کی عظمت و شان کا بھلا اس دنیا میں کوئی کیا اندازہ کر سکتا ہے! وہ عالی مقاموں کا دفتر ہے جس میں ان کے کارنامے درج ہوں گے۔

كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۙ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ (۲۰-۲۱)

لفظ 'عِلِّيُّوْنَ' چونکہ اپنے خاص لغوی مفہوم سے الگ ایک خاص اصطلاحی مفہوم میں استعمال ہوا ہے اس وجہ سے اس کی وضاحت فرما دی گئی ہے کہ یہ ایک دفتر ہے جس کی ہر چیز ضبطِ تحریر میں آئی ہوئی ہے اور جس کی نگرانی بھی اللہ تعالیٰ کے خاص مقرب فرشتے کرتے ہیں۔

'يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ' کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دفتر چونکہ مقربین کے ریکارڈ کے لیے خاص ہوگا اس وجہ سے اس میں انہی کی آمد و شد ہوگی، دوسروں کی یہاں رسائی نہ ہوگی۔ آگے آیت ۲۸ میں مقربین کا ذکر ہے۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۙ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ (۲۲-۲۳)

ابرار کا انعام

یہ ان نعمتوں کا ذکر آ رہا ہے جو ابرار کو حاصل ہوں گی۔ 'فِيْ نَعِيْمٍ' کے اسلوب بیان کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں کہ اس انداز میں جب بات کہی جاتی ہے تو مقصود یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ وہ ہر جانب سے نعمتوں میں گھرے ہوں گے، ان کی نگاہیں جدھر اٹھیں گی نعمت ہی نعمت ان کو نظر آئے گی۔

'عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ'۔ اوپر فجار سے متعلق تو فرمایا ہے: 'كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (۱۵)' اس کے بالکل برعکس ابرار کا حال یہ ہوگا کہ وہ اپنے تختوں پر بیٹھے ہوئے اللہ تعالیٰ کے افضال و عنایات اور اس کی شانیں اور جلوے دیکھ رہے ہوں گے۔ آگے یہ وضاحت بھی ہوئی ہے کہ تختوں پر بیٹھے بیٹھے ہی ان کو دشمنوں کا انجام بھی دکھایا جائے گا اور کہا جائے گا کہ کیوں، کافروں کو ان کے کیے کا بدلہ مل گیا نا! 'عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ۙ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (۳۵-۳۶)'

تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ (۲۴)

'نَضْرَةَ' اس تازگی و بشاشت کو کہتے ہیں جو نعمتوں میں گھرے ہوئے لوگوں کے چہروں پر جھلکتی ہے۔ فرمایا کہ جو بھی دیکھے گا ان کے چہروں پر نعمت کی تازگی اور بشاشت پائے گا۔

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ۙ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ۭ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۲۵-۲۶)

ان نعمتوں میں سے یہ ایک نعمت کا بطور مثال ذکر فرمایا کہ ان کو شراب خالص کے جام پلائے جائیں گے۔ یہ شراب سربمہر ہوگی جو اول اول انہی کے لیے کھولی جائے گی اور یہ مہر مشک کی ہوگی۔

ظاہر ہے کہ یہ چند صفات محض اس کا ایک اجمالی تصور دینے کے لیے بیان ہوئی ہیں۔ رہیں اس کی اصل صفات و کیفیات تو ان کا اندازہ انہی لوگوں کو ہو گا جو اس سے لطف اندوز ہوں گے۔ البتہ یہ فرما دیا کہ چاہنے کی چیز ہے تو یہ ہے جس کے لیے حوصلہ کرنے والوں کو حوصلہ کرنا چاہیے! یہ اہل ایمان کے لیے تشویق و ترغیب بھی ہے اور اس میں ان سگانِ دنیا پر طنز بھی ہے جو حیاتِ چند روزہ کی حقیر و فانی لذتوں کے حصول کی جدوجہد میں اپنے رات دن ایک کیے ہوئے ہیں اور چاہنے کی جو چیزیں ہیں ان کا چاہنے والا کوئی بھی نہیں ہے۔

وَمِزَاجُهٗ مِنۡ تَسۡنِيۡمٍ ۙ عَيۡنًا يَّشۡرَبُ بِهَا الۡمُقَرَّبُوۡنَ (۲۷-۲۸)

'مِزَاجٌ' سے مراد وہ ملونی ہے جو پینے والے پیتے وقت شراب میں اس کے کیف میں اضافہ یا اس کے اندر اعتدال پیدا کرنے کے لیے ملا لیتے ہیں۔ فرمایا کہ اس شراب میں ملونی تسنیم کی ہو گی۔ پھر تسنیم کی وضاحت فرما دی کہ یہ ایک چشمہ ہے جس کے کنارے بیٹھ کر مقربین اس شراب سے لطف اندوز ہوں گے۔

'عَيۡنًا' کا نصب علی سبیل الاختصاص ہے اور 'بِهَا' میں 'ب' میرے نزدیک ظرفیہ ہے۔ اس کی وضاحت عَيۡنًا يَّشۡرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوۡنَهَا تَفۡجِيۡرًا (الدھر-۷۶: ۶) کے تحت کر چکا ہوں۔ مے نوشی کے لوازم میں سے ایک چیز اس کا لب جُو ہونا بھی ہے۔ اس دنیا میں اس خانہ خراب کے رسیا تو جہاں پائیں اور جس طرح بھی پائیں پی لیتے ہیں، یہاں تک کہ پیالہ نہیں ملتا تو چلو ہی سے پی لیتے ہیں، لیکن یہ مقربین کی بزم مے نوشی ہے اس وجہ سے اس کے آداب اور ہیں۔

ہمارے مفسرین اور مترجمین پر اس 'ب' کی نوعیت واضح نہیں ہوئی ہے اس وجہ سے وہ یا تو اس سے کترا گئے ہیں یا اس کی غلط توجیہ پر راضی ہو گئے ہیں۔ مترجمین نے عام طور پر اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ 'اس سے پیتے ہیں'۔ لیکن یہ ترجمہ بالکل بے معنی ہے۔ اس کا مطلب اگر یہ سمجھا جائے کہ اس چشمہ میں سے پیتے ہیں تو یہ بات 'مِزَاجُهٗ مِنۡ تَسۡنِيۡمٍ' سے پوری ہو گئی اور نہایت واضح طور پر پوری ہو گئی پھر اس بات کو ایک بالکل مبہم انداز سے دہرانے کا فائدہ! یہ بات واضح رہے کہ ظرفیت کے لیے 'ب' کا استعمال اعلیٰ عربی میں معروف ہے، بالخصوص اس طرح کے مواقع میں تو ظرفیت کے سوا اور کوئی معنی لینے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ اَجۡرَمُوۡا كَانُوۡا مِنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا يَضۡحَكُوۡنَ (۲۹)

اعمال کے ظہور کے بعد انقلابِ حال

یہ اس انقلابِ حال کی تصویر ہے جو نیکوں اور بدوں کے درمیان اس وقت نمایاں ہو گا جب دونوں کے نتائج اعمال سامنے آ جائیں گے۔ پہلے اس صورتِ حال کی تصویر کھینچی ہے جس سے اہل ایمان، بالخصوص غریب مسلمان مغرور دولت مندوں کے ہاتھوں اس دنیا کی زندگی میں دوچار رہے۔ فرمایا کہ یہ مجرمین

جہاں ان کو پاتے اپنی فقرہ بازیوں اور پھبتیوں کا ہدف بنا لیتے۔

وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ (۳۰)

اور جب کبھی پاس سے گزرتے تو کن انکھیوں سے اشارہ کرتے۔

مَرُّوا بِهِمْ کا مطلب یہ بھی ہو سکتا کہ جب کبھی مسلمان ان کے پاس سے گزرتے اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جب کبھی ان فراعنہ کا گزر مسلمانوں کی طرف ہوتا تو کن انکھیوں کے اشاروں سے ان کے دلوں پر چرکے لگاتے۔ یہ امر واضح رہے کہ آنکھ کے اشاروں کے گھاؤ تیر اور تلوار کے گھاؤ سے بھی گہرے ہوتے ہیں اور تذلیل و تحقیر کا تو یہ خاص ہتھیار ہے۔ ان شاء اللہ سورۂ ھُمَزہ کی تفسیر میں اس کے بعض خاص پہلو زیر بحث آئیں گے۔

وَإِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمُ انْقَلَبُوا فَكِهِينَ (۳۱)

یعنی اہل ایمان کے ساتھ یہ بدتمیزیاں کر کے جب اپنے گھر والوں میں لوٹتے تو بہت مگن لوٹتے گویا کوئی بڑا میدان جیت کر لوٹے ہیں۔ یہ اشارہ ان کے سفلہ پن کی طرف ہے کہ بجائے اس کے کہ ان کو اپنی ان حرکتوں پر کچھ ندامت ہو وہ ان کا ذکر بڑے فخر سے اپنے گھر والوں میں کرتے کہ انھوں نے فلاں کے اس طرح لتے لیے اور فلاں کو یوں لتاڑا۔ سورۂ قیامہ میں یہی بات یوں بیان ہوئی ہے: وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝ ثُمَّ ذَهَبَ إِلٰٓى أَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى (القیٰمۃ - ۷۵: ۳۲-۳۳)

یہاں وہ بات یاد رکھیے جو قرآن میں اہل ایمان کے کردار سے متعلق مذکور ہوئی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے اہل اور متعلقین کے اندر ایک محتاط آدمی کی طرح زندگی گزارتے ہیں کہ ان کے کسی رویہ سے ان کو کوئی غلط سبق نہ ملے جو قیامت کے دن اُن کے لیے تباہی اور اِن کے لیے رسوائی کا باعث ہو۔ اس کے برعکس ان اشرار کا یہ کردار بیان ہوا ہے کہ یہ باہر اہل ایمان کے ساتھ جو غنڈہ گردی کر کے لوٹتے ہیں اس کی داستان فخر کے ساتھ گھر والوں کو بھی سناتے ہیں تاکہ ان کی پوری نسل غنڈوں کی نسل بن جائے۔

وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَ (۳۲)

اور ان کی یہ کوشش بھی ہوتی کہ ان اہل ایمان سے متعلق کسی کے اندر کسی نوعیت کا کوئی حسن ظن نہ پیدا ہونے پائے۔ چنانچہ جب بھی وہ ان کو دیکھتے ان کے بارے میں لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے کہ یہ پکے گمراہ ہیں اس لیے کہ یہ دین آبائی کے دشمن ہیں اور اپنے سوا سب کو جہنم کا ایندھن سمجھتے ہیں۔ یہ امر یہاں پیش نظر رہے کہ مسلمانوں کے ذکر و فکر آخرت کو دیکھ کر بہت سے لوگوں کے ذہن متاثر ہونے لگے تو قریش کے لیڈروں نے ان کا یہ توڑ نکالا کہ ان کو گمراہ اور بے دین ثابت کرنا شروع کیا۔ اس کے لیے جو دلیلیں انھوں نے ایجاد کیں ان کی تفصیلات اپنے محل میں گزر چکی ہیں۔

وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حٰفِظِينَ (۳۳)

عام طور پر تو لوگوں نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ یہ کفار ان مسلمانوں پر کوئی نگران اور اتالیق تو نہیں مقرر کیے گئے تھے کہ ان کو ضالّ و مضلّ ٹھہرائیں اور ان کے اعمال و عقائد پر نکیر کریں لیکن میرے نزدیک یہ کفار ہی کے قول کا ایک حصّہ نقل ہوا ہے یعنی پوری بات یوں ہے کہ جب وہ مسلمانوں کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ پکے گمراہ ہیں، یہ ہمارے اعمال و عقائد کو کفر و شرک قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ ہمارے اوپر داروغہ مقرر کر کے نہیں بھیجے گئے ہیں کہ ہماری ہر چیز پر اعتراض اٹھائیں اور ہماری اصلاح کے مدّعی بن کر کھڑے ہوں۔

فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ (۳۴)

کفار کے رویہ کی تفصیل کے بعد اب یہ اس انقلابِ حال کا ذکر ہے جو قیامت کے دن واقع ہوگا۔ فرمایا کہ اب تک تو کفار مسلمانوں کے حال پر ہنستے رہے لیکن اب اہلِ ایمان کفار کے حال پر ہنسیں گے۔ اہلِ ایمان کا یہ ہنسنا بالکل جائز ہوگا۔ جب انھوں نے کفار پر حجت تمام کر دی اور انھوں نے کوئی اصلاح قبول کرنے کے بجائے الٹے انہی کو مجرم ٹھہرایا تو وہ اسی کے سزاوار ہوں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو کوئی ہمدردی نہ ہو۔

عَلَى الْأَرَائِكِ يَنْظُرُونَ (۳۵)

یعنی وہ جس طرح اپنے تختوں پر بیٹھے بیٹھے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے جلوے دیکھتے ہوں گے اسی طرح اپنے تختوں پر بیٹھے ہی بیٹھے جب چاہیں گے جھانک کے دوزخ میں کفار کا حال بھی دیکھ لیں گے بلکہ ان سے سوال و جواب بھی کر لیں گے، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات میں تصریح ہے۔

هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (۳۶)

یہ سب کچھ دیکھ دکھا لینے کے بعد اہلِ ایمان سے بطور طلبِ تصدیق یہ سوال ہوگا کہ کیوں کفار کو اپنے کیے کا پورا پورا بدلا مل گیا نا!

مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ میں کفار کی وہ بدتمیزیاں بھی شامل ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ فضلہ واحسانہ۔

رحمان آباد
۱۴ - اگست ۱۹۷۹ء
۲۰ - رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ